وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ (۳/۸۴)

اسلام کیا ہے؟

محترم پرویز صاحب کی تقریر

جس سے انہوں نے طلوعِ اسلام کنونشن (سنہ ۱۹۶۲ء) کے آخری کھلے اجلاس سے خطاب کیا

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ لاہور

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ (۳/۸۵)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اسلام کیا ہے؟

اسلام نام ہے قوانین خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کا۔ ان کی اطاعت کرنے کا۔ ان کے مطابق زندگی بسر کرنے کا۔ اس کے برعکس، ان قوانین سے انکار، انحراف اور سرکشی کا نام کفر ہے۔

کائنات کی سجدہ ریزی

۲۔ آپ اس عظیم القدر اور محیر العقول کارگہِ کائنات پر نگاہ ڈالئے۔ اس میں ہر شے لگے بندھے قانون کے مطابق مصروفِ عمل ہے۔ کسی کو ان قوانین سے یارائے انحراف نہیں۔ مجالِ سرکشی نہیں۔ کوئی اُس راستے سے ذرا اِدھر اُدھر نہیں ہٹ سکتا جو اس کے لئے متعین کر دیا گیا ہے۔

اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یَسۡجُدُ لَہٗ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَنۡ فِی الۡاَرۡضِ وَ الشَّمۡسُ وَ الۡقَمَرُ وَ النُّجُوۡمُ وَ الۡجِبَالُ وَ الشَّجَرُ وَ الدَّوَآبُّ ...... [1] (۲۲/۱۸)

کیا تو نے اس پر غور نہیں کیا کہ ارض و سما میں جو کچھ ہے۔ اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور جاندار ...... سب قوانین خدا کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔

یہ سب اُس کے قوانین کے سامنے سرِ تسلیم خم کئے ہیں اور ان میں سے کسی کو ان سے مجالِ سرکشی نہیں۔

---

[1] اس مقام پر آیت کا باقی حصہ چھوڑ دیا گیا ہے۔ اس کا مقام آگے چل کر آئے گا۔

وَ لِلّٰہِ یَسْجُدُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّۃٍ وَ الْمَلٰٓئِکَۃُ وَھُمْ لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ ٥ (۱۶/۴۹)

کائنات کی پستیوں اور بلندیوں - ارض و سمٰوٰت میں - جو کچھ ہے، خواہ وہ جاندار مخلوق ہو یا فطرت کی قوتیں سب قوانین خداوندی کے سامنے سربسجود ہیں اور اس سے کبھی سرکشی اختیار نہیں کرتے۔

ان کا منصب زندگی اور نہج حیات یہ ہے کہ یَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ ٥ (۱۶/۵۰) جو حکم انہیں دیا جاتا ہے، اس کے مطابق کام کئے چلے جاتے ہیں۔

قرآن کریم نے اوپر کہا ہے کہ کیا تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ ارض و سمٰوٰت میں جو کچھ ہے، سب قوانین خدا کے سامنے سجدہ ریز ہے؟ اس حقیقت پر غور کرنا تو بہت بڑی بات ہے کہ وہ کونسے قوانین ہیں جن کے مطابق کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں ہر شے سرگرم عمل ہے اور وہ چیزیں ان قوانین کی اطاعت کس طرح کرتی ہیں۔ ہم میں سے کتنے ہیں جنہوں نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ جنہیں قرآن

سمٰوٰت کی تحیّر انگیزی

کریم "سمٰوٰت" (بلندیاں) کہہ کر پکارتا ہے، وہ کس قدر تحیّر انگیز مظاہر فطرت کا گہوارہ ہیں۔ اس زمانہ میں، وسائل رسل و رسائل کی کثرت اور ذرائع آمد و رفت کی فراوانی نے، اس حقیقت کو توہم سمجھ گئے ہیں کہ ہماری زمین ایک عظیم الجثّہ کُرّہ ہے جو ہر وقت گردش میں مصروف ہے۔ لیکن ہم میں سے بہت کم ہوں گے جنہیں اس کا علم ہو گا کہ کائنات کی ان حدود فراموش بلندیوں میں جس قدر اجرام فلکی تیر رہے ہیں، ان میں ہماری زمین کی حیثیت اتنی ہی ہے جتنی صحرائے اعظم میں ریت کے ایک ذرّے کی۔ یہ مثال شاعری نہیں، حقیقت پر مبنی ہے۔ یہ سورج ـــــ جو ہمیں ایک طشت سے زیادہ بڑا نظر نہیں آتا۔ اور جو ہم سے زیادہ دور بھی نہیں۔ صرف نو کروڑ انتیس لاکھ (۹،۲۹،۰۰،۰۰۰) میل دور ہے۔ اس کا قطر ہماری زمین سے ۱۰۹ گنا، بڑا ہے۔ یعنی آٹھ لاکھ- چونسٹھ ہزار (۸،۶۴،۰۰۰) میل۔ اس کی جسامت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اس میں ہماری زمین جیسی تیرہ لاکھ زمینیں سما سکتی ہیں۔

لیکن یہ اس قدر عظیم کرّہ، بایں ہمہ ضخامت و جسامت، دیگر اجرام سماوی کے مقابلہ میں اتنی ہی حیثیت رکھتا ہے جتنی سمندر میں ایک قطرہ۔

یہ ستارے جو شب کی تاریکیوں میں ٹمٹماتے چراغ دکھائی دیتے ہیں، ان میں سے جو ستارہ ہم سے قریب ترین ہے، وہ ہم سے کتنی دور ہے اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ جتنی دور ہم سے سورج ہے، اتنے

دو لاکھ ستر ہزار سے ضرب دیجئے تو اس کا ہم سے اتنے میلوں کا فاصلہ ہے۔ ہمارا قریب ترین ستارہ ہم سے اتنی دور ہے۔

اجرام فلکی کے فاصلے، ہماری سڑکوں کے میلوں سے نہیں ماپے جاتے۔ انہیں "روشنی کے سالوں" سے ماپتے ہیں۔ روشنی، ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ کی رفتار سے سفر کرتی ہے۔ اس سے آپ سمجھ لیجئے کہ وہ ایک سال میں کس قدر مسافت طے کرتی ہوگی۔ ایسے ستارے بھی ہیں جن کی روشنی ہم تک ۱،۸۵،۰۰۰ سال میں پہنچتی ہے۔ پھر سمجھ لیجئے کہ روشنی، ایک سیکنڈ میں ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل کی مسافت طے کرتے ہوئے، اس ستارے سے ہم تک ایک لاکھ، پچاسی ہزار سال کے عرصے میں پہنچتی ہے۔ یہ تو خیر دور کے ستاروں کی بات ہے۔
یہ کہکشاں، جسے ہمارے شاعر گردِ مرمریں کہہ کر آگے گزر جاتے ہیں، لاتعداد "ستاروں کی دنیا" کا مجموعہ ہے۔ ان میں سے قریب ترین ستارے کی روشنی ہم تک اٹھارہ ہزار چار سو روشنی کے سال میں پہنچتی ہے۔ آسمان میں ستارے کتنے ہیں، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اگر ہم ڈیڑھ ہزار ستارہ فی منٹ کے حساب سے گننے لگیں، تو سات سو سال میں ان کی گنتی پوری ہو۔

اور "ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں"۔ اس دنیا کو ہیولیٰ کائنات (NEBULA) کہا جاتا ہے۔
ہماری دوربین، جس بعید ترین ہیولیٰ کو اس وقت تک پا سکی ہے وہ ہم سے پچیس کروڑ روشنی کے سال (LIGHT YEARS) کے فاصلے پر ہے۔ یعنی وہاں سے روشنی، ایک سیکنڈ میں، ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل کی مسافت طے کرتے ہوئے، ہم تک پچیس کروڑ سال میں پہنچ سکتی ہے۔

آپ نے سمٰوٰت کی وسعتوں اور بلندیوں کا اندازہ فرمایا؟ یہ ہیں وہ سمٰوٰت جن میں ہر شے، قوانینِ خداوندی کے مطابق سرگرمِ عمل ہے اور کسی کو اس کی مجال نہیں کہ اپنے مقررہ راستے سے اِنچ کا ہزارواں حصہ بھی اِدھر اُدھر ہو جائے یا اس کی رفتار میں سیکنڈ کے کروڑویں حصے کا بھی فرق پڑ جائے۔

کششِ ثقل

یہ تمام اجرام فلکی، کائنات کی فضا میں معلق ہیں۔ یعنی ایسے ستونوں سے جکڑے ہوئے جنہیں قرآن کریم "غیر مرئی" کہہ کر سمجھاتا ہے۔ جہاں کہتا ہے کہ اَللّٰهُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا (۱۳/۲) اللہ وہ ہے جس نے ان تمام عظیم القدر اجرام سماوی کو بلندیوں میں تھام رکھا ہے، بغیر ایسے ستونوں کے جنہیں تم دیکھ سکو۔ یہ غیر مرئی ستون، وہ کششِ ثقل (GRAVITATIONAL PULL) ہے جو ایک دوسرے کو تھامے ہوئے ہے۔

آپ نے فضائے آسمانی کی وسعتوں اور اجرام سماوی کی تعداد کے متعلق کچھ سن لیا ہے اور یہ بھی

دیکھ لیا ہے کہ ان مختلف اجرام میں فاصلہ کس قدر ہے۔ اور پھر یہ بھی معلوم کر لیا ہے کہ ان تمام اجرام فلکی کو ایک دوسرے کی کشش تھامے ہوئے ہے۔ اس کشش ثقل سے متعلق قانون کی ہمہ گیری کا اندازہ اس سے لگائیے کہ سر جیمز جینز کے الفاظ میں، اگر ہم اپنی ایک انگلی بھی ہلائیں تو اس کا اثر اجرام فلکی میں سے ہر ایک پر پڑتا ہے۔ اجرام فلکی کے وزن جسامت فاصلہ وغیرہ کے متعلق جس قدر معلومات حاصل کی جاتی ہیں، ان کی بیشتر بنیاد کشش ثقل کا محیرالعقول قانون ہے۔ اور یہ قانون ایسا اٹل ہے کہ اگر کسی ستارے یا کرے کی کشش کے تناسب میں غیر محسوس سا فرق بھی آجائے تو کائنات کا سارا سلسلہ درہم برہم ہو جائے۔

یہ تو اس بے پایاں فضا میں تیرنے والے عظیم الجثہ اجرام فلکی کی محیرالعقول عظمتوں اور وسعتوں کا ہلکا سا تصور ہے۔ دوسری طرف ذرات کی طرف آیئے تو ایک قطرہ پانی میں کروڑوں سالمات (MolECULES) ہوتے ہیں۔ اور ہر سالمہ میں ایک ایٹم آکسیجن کا اور دو ایٹم ہائیڈروجن کے ہوتے ہیں۔ ہائیڈروجن کے ایک ایٹم کا قطر، ایک سنٹی میٹر کا دس کروڑواں حصہ ہوتا ہے۔ اس ذرۂ ناچیز پر نگاہ رکھئے اور پھر اس کی اس عظمت پر کہ نظام شمسی کی طرح اس کا اپنا نظام ہے جس میں ایک مرکزی ہیولیٰ ہوتا ہے اور اس کے گرد ایک برقیہ (ELECTRON) گردش کرتا ہے۔ یہ برقیہ، سالمہ کے لاکھویں حصے کے برابر ہوتا ہے۔ اس کی رفتار کا اندازہ اس سے لگائیے کہ یہ اپنے محور کے گرد ایک سیکنڈ کے دس لاکھویں حصہ میں، سات ارب دفعہ گردش کرتا ہے۔ اور یہ گردش ایک غیر متبدل قانون کے مطابق ہوتی ہے۔

یہ ہے کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کی نہایت خفیف سی جھلک۔

قرآن کریم نے اس تحیر انگیز نظام کائنات کو ایک لفظ میں بیان کر دیا ہے۔ اور وہ لفظ ہے ——— اسلام ——— اور اسی کو اس نے دین اللہ کہا ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں ہے۔

یہ کائناتی اسلام ہے

أَفَغَيْرَ دِيْنِ اللهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَ إِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ۝ (۳/۸۲)

کیا یہ لوگ دین اللہ۔ نظام خداوندی۔ کے خلاف کوئی اور نظامِ زندگی اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ ارض و سمٰوات میں جو کچھ ہے، سب طوعاً و کرہاً اس نظام کے سامنے سر تسلیم خم کئے ہے۔ اور ہر ایک کی گردش اسی محور کے گرد ہے۔

یعنی وہ نظامِ زندگی جسے خدا نے تجویز کر رکھا ہے، دینَ اللہ کہلاتا ہے اور کائنات کی ہر شے اسی دین کو اختیار

گئے ہے۔ اس نظامِ زندگی کو اختیار کرنے کا نام الاسلام ہے۔ یہی اندازِ زندگی صحیح منزلِ مقصود تک پہنچا سکتا ہے۔ وَ مَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَ هُوَ فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ○ (۳/۸۵)۔ جو کوئی الاسلام کے علاوہ کوئی اور نظامِ زندگی چاہتا ہے، تو وہ نظام کبھی قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ اور وہ آخر الامر نقصان اٹھائے گا۔

اس سے ظاہر ہے کہ کائنات کی ہر شے کا دین (نظامِ زندگی) اسلام ہے۔ ہر شے قوانینِ خداوندی کی اطاعت کر رہی ہے۔ یہ اطاعت، ایک مقصدِ عظیم کے حصول کے لئے ہے جسے خدا نے تجویز کر رکھا ہے۔ ہر شے کی تگ و تاز اور جد و جہد، خدا کے متعین کردہ پروگرام کی تکمیل کے لئے ہے۔ بَلْ لَّهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ○ (۲/۱۱۶) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب خدا کے تجویز فرمودہ پروگرام کی تکمیل کے لئے مصروفِ عمل ہے اور ہر ایک نے اپنی تمام صلاحیتوں کو اسی مقصد کے لئے محفوظ اور وقف کر رکھا ہے۔ "قَانِتُوْنَ" کا لفظ بڑا معنی خیز ہے۔ سِقَاءٌ قَنِيْتٌ اُس مشکیزے کو کہتے ہیں جو پانی کا ایک قطرہ بھی ضائع نہ ہونے دے اور اسے برمحل صرف کرنے کے لئے روک کر رکھے۔ اشیائے کائنات میں لامحدود قوتیں ودیعت کر کے رکھ دی گئی ہیں۔ ایک سورج کی توانائی ہی کو دیکھئے۔ وہ حرارت اور روشنی کا کیسا عظیم (RESERVOIR) ہے۔ لیکن کیا مجال جو اپنی توانائی کی ایک رمق بھی، اس مقصد کے علاوہ کسی اور مقصد میں صرف کر جائے جو اس کے لئے مقرر کر دیا گیا ہے۔ اس کے ذمے ایک فریضہ عائد کر دیا گیا ہے اور وہ اس فریضہ کی ادائیگی میں رات دن سرگرداں ہے۔ اسے عربی زبان میں "تَسْبِيْح" کہتے ہیں۔ سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ (۵۷/۱)۔ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے، سب، نظامِ خداوندی کی تکمیل میں پوری شدت اور تیزی سے سرگرمِ عمل ہے۔ اُس خدا کے نظام کی تکمیل میں جو بڑی قوتوں اور عمدہ تدبیروں کا مالک ہے۔ نظامِ خداوندی کا یہی وہ تاگہ ہے جس میں اس نے اشیائے کائنات کے "تسبیح کے دانوں" کو اس حسن و خوبی سے پرو رکھا ہے کہ کوئی ذرا اِدھر اُدھر نہیں ہٹ سکتا۔ ان عظیم عناصر کو اس طرح قانون کی زنجیروں میں جکڑ رکھنے سے مقصد یہ ہے کہ انسان ان سے کام لے سکے۔

تسخیرِ کائنات

وَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْهُ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ○ (۴۵/۱۳)۔

کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے، خدا نے اس سب کو تمہارے فائدے کے لئے قانون کی زنجیروں سے

مسخر کر رکھا ہے۔ اَللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ اللہ وہ ہے جس نے کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کو پیدا کیا۔ وہ بادلوں سے مینہ برساتا ہے اور اس سے پھل پیدا ہوتے ہیں جو تمہارے لئے سامان زیست ہیں وَ سَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِیَ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ۚ اس نے تمہارے لئے جہازوں کو قانون کی زنجیروں میں مسخر کر رکھا ہے جو اس کے قانون کے مطابق تیرتے پھرتے ہیں وَ سَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ ۚ اور اس نے تمہارے لئے دریاؤں کو بھی قانون کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے۔ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ دَآئِبَیْنِ ۚ کشتیاں۔ سمندر اور نہریں ہی نہیں۔ اس نے تمہارے لئے سورج اور چاند تک کو قانون کے حلقوں میں باندھ رکھا ہے اور وہ مسلسل و متواتر چل رہے ہیں۔ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الَّیْلَ وَ النَّهَارَ ۚ (۱۴/۳۲-۳۳)۔ اور اسی طرح اُس نے دن اور رات کو تمہارے فائدے کے لئے ایک نظام کے تابع رکھ چھوڑا ہے۔

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کار اند
کہ تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری

کائنات کی طرف وحی

وہ قوانین جن کے مطابق اشیائے کائنات نے اپنے اپنے فرائض کو سرانجام دینا ہے، ان کے اندر ودیعت کر کے رکھ دیئے گئے ہیں، انہی کو قوانینِ فطرت (LAWS OF NATURE) کہا جاتا ہے۔ یہ وہ وحیِ خداوندی ہے جو ان میں سے ہر ایک کی طرف براہ راست ہوتی ہے۔ وَ اَوْحٰی فِیْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا (۴۱/۱۲)۔ اور اس نے ہر سماء (بلندی) میں اسکے قانون کو وحی کر دیا۔ اور اسی طرح ارض میں بھی۔ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰی لَهَا (۹۹/۵)۔ یہی وہ وحی ہے جس کی رُو سے کائنات کی ہر شے، اپنی اپنی صلوٰۃ اور تسبیح سے واقف ہے كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَ تَسْبِیْحَهٗ (۲۴/۴۱)۔ ہر شے یہ بھی جانتی ہے کہ اس کے فرائض زندگی کیا ہیں اور یہ بھی کہ ان کی ادائیگی کے لئے اس کے دوائرِ تگ و تاز کونسے ہیں۔ اسی کو خدا نے اپنی طرف سے عطا کردہ ہدایت یا راہ نمائی سے تعبیر کیا ہے۔ جب فرعون نے حضرتِ موسیٰؑ سے پوچھا کہ تمہارا رب کون ہے تو انہوں نے جواب میں کہا کہ رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی كُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی (۲۰/۵۰)۔ ہمارا نشوونما دینے والا وہ ہے جس نے ہر شے کو تخلیقی پیکر عطا کیا۔ اسے پیدا کیا۔ اور پھر اسے وہ راہ نمائی عطا کر دی جس کے مطابق اس نے سفر زندگی طے کرنا ہے۔ اشیائے کائنات میں خدا کی یہ راہ نمائی کس محیر العقول انداز سے کارفرما ہے۔ اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جنہوں نے

اس راہ نمائی کی مثالیں

ان چیزوں کی زندگی کا مطالعہ اور مشاہدہ کرنے میں اپنی عمریں صرف کی ہیں ان کے مشاہدات کے نتائج ایسے تحیّر انگیز ہیں کہ انہیں دیکھ کر انسان ورطۂ حیرت میں ڈوب جاتا ہے۔ (مثلاً) یورپ اور شمالی افریقہ کی جھیلوں اور ندیوں میں ایک مچھلی پائی جاتی ہے جسے ایل (EEL) کہتے ہیں۔ ایک خاص عمر کو پہنچ جانے کے بعد یہ مچھلیاں اپنے اپنے مساکن سے باہر نکلنی شروع ہو جاتی ہیں۔ وہ رات کی تاریکیوں میں دلدل اور گھاس میں سے گذرتی ہوئی ایک سے دوسری جھیل اور ندی میں پہنچتی ہیں اور اس طرح آہستہ آہستہ ہزاروں میل کا سفر طے کر کے بحر اطلانطک میں، جزیرہ برموڈا کے قریب پہنچ جاتی ہیں جہاں سمندر بہت گہرا ہے۔ دوسری طرف، امریکہ کی ایل مچھلیاں بھی اسی طرح وہاں پہنچ جاتی ہیں۔ یہ مچھلیاں، گہرے سمندر میں انڈے دیکر، مر جاتی ہیں۔ ان کے بچے، انڈوں سے نکلنے کے بعد اپنے اپنے آبائی وطن کی طرف چل نکلتے ہیں اور انہی راستوں سے ہوتے ہوئے، جن سے ان کے ماں باپ گزرے تھے، اپنی اپنی جھیلوں اور ندی نالوں میں پہنچ جاتے ہیں۔ ان میں سے نہ کوئی راستہ بھولتا ہے اور نہ ہی کسی غلط جگہ پہنچتا ہے۔ اس سفر میں انہیں تین سال تک کا عرصہ لگ جاتا ہے۔ یہ سلسلہ اسی طرح جاری ہے۔ مشاہدہ کرنے والے ان کے حالات کا مشاہدہ کرتے ہیں لیکن یہ راز کسی پر نہیں کھلتا کہ وہ کونسی قوت ہے جو ان انڈوں سے پیدا ہونے والے بچوں کو، جن کے ماں باپ ان کی پیدائش سے پہلے مر چکے تھے، ان کے آبائی وطن کی طرف راہ نمائی کرتی ہے۔ اور وہ ہزاروں میل کی مسافت میں کہیں راستہ نہیں بھولتے۔

یہی کیفیت سالمن مچھلی کی ہے۔ ہر نوزائیدہ سالمن، کچھ وقت کے لئے سمندر میں جا کر رہتی ہے۔ پھر واپسی پر سمندر سے اس دریا میں پہنچتی ہے جس سے وہ سمندر میں داخل ہوئی تھی۔ اس دریا سے، اُس معاون ندی کا رُخ کر لیتی ہے جو اسے اس دریا میں لائی تھی۔ اور اس ندی سے پھر اپنی مرز بوم تک پہنچ جاتی ہے۔ اگر آپ اسے راستے میں پکڑ کر کسی غلط ندی میں چھوڑ دیں، تو وہ آگے بڑھنے کے بجائے فوراً پیچھے کی طرف لوٹ کر،[1] بڑے دریا میں پہنچ جاتی ہے اور وہاں سے اپنی صحیح ندی میں داخل ہو جاتی ہے۔ وہ اس میں کبھی غلطی نہیں کرتی۔

یہی کیفیت مہاجر پرندوں (MIGRATORY BIRDS) کی ہے۔ بحر الکاہل میں بہت سے جزیرے ہیں جہاں خاص قسم کے پرندوں کے سوا کوئی جاندار نہیں ملتا۔ یہ پرندے۔ سردی کے موسم میں جزائر ہوائی (HAWAII) میں چلے جاتے ہیں۔ انہیں یہ دو ہزار تین سو میل کا سفر، سمندر کے اوپر

---

[1] اس کو توبہ کہتے ہیں۔

ایک ہی اڑان میں کرنا ہوتا ہے۔ وہ وہاں انڈے دیکر واپس آجاتے ہیں۔ اس کے بعد جب ان کے بچے اڑنے کے قابل ہوجاتے ہیں، تو وہ اپنے ماں باپ کے "نقشِ قدم" پر جن کا کوئی نشان نہیں ہوتا۔ اور جنہیں انہوں نے دیکھا تک نہ تھا، سیدھے اپنے اپنے مقام پر پہنچ جاتے ہیں۔ فضا کی پہنائیوں میں، سمندر کے اوپر، وہ کونسے نشانات راہ ہیں جو انکی راہ نمائی، ان کے مستقر کی طرف کرتے چلے جاتے ہیں؟ یہ راہ نمائی وہی ہے جو خدا کی "وحی" نے ان کے اندر رکھدی ہے۔ رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی كُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی۔ اسی سلسلہ میں ایک مبصر مسٹر (C.T. HUDSON) نے اپنی کتاب (BIRDS AND MAN) میں اس قسم کے مہاجر پرندوں کا ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ان مہاجرین کا قافلہ اڑ گیا تو پیچھے دو پرندے رہ گئے۔ ان میں سے ایک زمین پر چلتا تھا اور دوسرا اس سے ذرا آگے فضا میں اڑتا تھا۔ اڑنے والا پرندہ، تھوڑی دور جا کر پیچھے مڑکر دیکھتا۔ چلنے والے پرندے کو آواز دیتا۔ لیکن جب وہ اپنی رفتار میں تیزی نہ کرتا، تو وہ بھی نیچے اتر آتا تاآنکہ وہ اس کے ساتھ آملتا۔ وہ پھر اُڑتا ـــ دونوں اس طرح، افتاں و خیزاں، اپنے قافلے کے رخ پر چلتے جاتے۔ اس نے قریب جاکر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ان میں سے ایک نر اور دوسری مادہ ہے۔ مادہ کا ایک بازو ٹوٹا ہوا ہے اور وہ اڑنے کے قابل نہیں۔ نر اسے تنہا چھوڑ کر، اکیلا نہیں جانا چاہتا۔ اس لئے کہ وہ اس کی رفیقۂ حیات ہے۔ انسان کا بچہ ہوتا تو اپنی پرشکستہ بیوی کو لات مارکر الگ کر دیتا اور خود دوسری لے آتا!

بہرحال، یہ ضمنی بات تھی۔ کہا یہ جا رہا تھا کہ کائنات میں ہر شے کو خدا کی طرف سے راہ نمائی ملتی ہے اور وہ، بلا چون وچرا، اس راہ نمائی کا اتباع کرتی چلی جاتی ہے۔ ان میں سے کسی کو اس راہ نمائی سے مجالِ انکار یا یارائے سرکشی نہیں۔ اسی سے یہ عظیم القدر سلسلۂ کائنات اس حسن وخوبی سے سرگرمِ عمل ہے کہ اس میں کہیں کوئی سلوٹ۔ کہیں کوئی جھول نظر نہیں آتی۔ مَا تَرٰی فِیْ

کوئی سلوٹ یا جھول نہیں

خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ۔ تم خدائے رحمٰن کی تخلیق میں، کسی قسم کا عدم تناسب نہیں دیکھو گے۔ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ۔ ذرا نگاہ کو پلٹ کر دیکھو تو سہی۔ کیا کہیں کوئی نقص، کوئی شگاف، کوئی عیب نظر آتا ہے؟ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَیْنِ۔ ایک بار نہیں، عقابِ نگاہ کو بار بار، کائنات کی پہنائیوں میں چھوڑو۔ یَنْقَلِبْ اِلَیْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّ هُوَ حَسِیْرٌ (۶۷/۳-۴)۔ اسے کہیں کوئی نقص نظر نہیں آئے گا اور وہ خاسر و نامراد، ہار تھک کر کاشانۂ چشم میں لوٹ آئے گی۔

یہ اس لئے کہ ساری کائنات، دینِ خداوندی ـــ الاسلام ـــ کے مطابق چل رہی ہے۔

اس لئے ہو نہیں سکتا کہ اس میں کوئی خلل، کوئی فساد۔ کوئی فتنہ، کوئی فطور ہو۔ فتنہ و فساد تو غیر اسلامی زندگی میں ہوتا ہے۔ اسلامی نہج زندگی میں فتنہ و فساد کا کیا کام؟
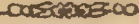
انسانی دنیا

جب عالم موجودات کی ہر شے کے لئے ایک قانونِ زندگی اور ضابطۂ حیات متعین ہے، تو کیا انسان جو اس خطۂ ارض پر سلسلۂ ارتقا کی آخری کڑی، اور نظمِ کائنات کا حسین مقطع ہے، اس ضبط و آئین سے مستثنیٰ ہوگا؟ ایسا نہیں ہوسکتا۔ یہ نظام کائنات کے خلاف ہوگا۔ جب کائنات کی ہر شے ایک نہج و اسلوب کے مطابق زندگی بسر کر رہی ہے تو انسان کے لئے بھی ضروری ہے کہ ایک خاص ضابطۂ حیات کے مطابق دنیا میں رہے۔ یہ طریقِ حیات اور نہج زندگی وہی ہے جسے ہم نے ابھی ابھی الاسلام کہہ کر پکارا ہے۔ اشیائے کائنات کے متعلق کہا گیا تھا کہ وَلَهُ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ (۳/۸۲)۔ انسانوں کے متعلق بھی کہا گیا کہ بَلٰى مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلّٰهِ وَ هُوَ مُحْسِنٌ ...... (۲/۱۱۲)۔ اشیائے کائنات کے متعلق کہا گیا تھا کہ كُلٌّ لَهُ قَانِتُونَ (۲/۱۱۶)۔ انسانوں سے کہا گیا کہ قُومُوا لِلّٰهِ قَانِتِينَ (۲/۲۳۸)۔

جسمانی زندگی

انسان کی زندگی کے دو حصے، یا دو سطحیں ہیں۔ ایک سطح وہ ہے جسے طبیعی زندگی PHYSICAL LIFE کہا جاتا ہے۔ یہ اس کے جسم کی زندگی ہے اور اس پر وہی قوانین نافذ ہیں جن کے ماتحت حیوان زندگی بسر کرتے ہیں — کھانا، پینا، سونا، افزائشِ نسل وغیرہ — پانی جس طرح ایک بیل کی پیاس بجھاتا ہے، اسی طرح انسان کے لئے وجۂ تسکین ہوتا ہے۔ اچھی غذا جس طرح ایک گھوڑے کی پرورش کرتی ہے اسی طرح انسان کے لئے بھی فربہی اور تقویت کا موجب بنتی ہے۔ سنکھیا جس طرح ایک کتے کو ہلاک کر دیتا ہے اسی طرح انسان کو بھی مار دیتا ہے۔ یہ بھی قوانین خداوندی ہیں جن کے مطابق زندگی بسر کرنے سے، انسان کو طبیعی زندگی کی آسائشیں حاصل ہوتی ہیں اور جن کی خلاف ورزی اس کے لئے مضرت رساں ہوتی ہے۔ لیکن انسانی زندگی کی دوسری سطح وہ ہے جو اسے حیوانات سے یکسر الگ اور ممتاز کر دیتی ہے۔

انسانی زندگی

اگر پہلی سطح کی زندگی کو اس کی حیوانی زندگی (ANIMAL LIFE) کہا جائے تو اس دوسری سطح زندگی کو اس کی "انسانی زندگی" (HUMAN LIFE) سے تعبیر کرنا مناسب ہوگا۔ اس کی حیوانی سطح کا مدار اس کے طبیعی جسم پر ہے۔ لیکن اس کی انسانی زندگی کا قیام، اس کی ذات سے وابستہ ہے جسے (HUMAN PERSONALITY) کہا جاتا ہے۔ جس طرح اس کے

جسم کی پرورش کے لئے قوانین مقرر ہیں، اسی طرح اس کی ذات کی نشو و نما کے لئے بھی اصول وضوابط متعین ہیں۔ اگر ان اصول وضوابط کے مطابق انسانی ذات کی نشو ونما ہو جائے تو جسم کی موت کے بعد بھی انسان، زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ یہ اصول وقوانین جن کے مطابق انسانی ذات کی نشوونما ہوتی ہے مستقل اقدار کہلاتے ہیں۔ یہ انسان کو، خدا کی طرف سے بذریعہ وحی ملے ہیں، لیکن اس وحی اور اُس وحی کے طریق میں بنیادی فرق ہے جو اشیائے کائنات کی طرف کی جاتی ہے اور جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔

انسانی ذات کی بنیادی خصوصیت، اس کا صاحب اختیار وارادہ ہونا ہے۔ یہی وہ خصوصیت ہے جس سے انسان، حیوانات سے متمیز ہوتا ہے اور جو اس کے لئے باعث صد شرف وافتخار ہے۔ اسی اختیار وارادہ کا نتیجہ ہے کہ انسان کی طرف وحی بھیجنے کا طریق الگ تجویز کیا گیا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ بے جان اشیائے کائنات میں سے ہر شے کے اندر، اور جانداروں کی ہر نوع کے ہر فرد کے اندر پیدائشی طور پر، وہ راہ نمائی رکھ دی گئی ہے جس کے مطابق انہوں نے اپنی زندگی بسر کرنی ہے۔ بالفاظِ دیگر یہ چیز ان کی جبلت میں داخل ہے۔ اور جبلت کے معنی یہ ہیں کہ اس کی پیروی مجبوراً کی جائے اس سے گریز اور مفر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ وجہ ہے کہ (انسان کے علاوہ) کائنات کی ہر شے ان قوانین کی اطاعت از خود کئے جارہی ہے جو اس کے لئے خدا کی طرف سے تجویز کر دیئے گئے ہیں۔ اگر انسانی ذات سے متعلق اصول وقوانین بھی، ہر انسانی بچے کے اندر، پیدائش کے ساتھ ہی ودیعت کر دیئے جاتے، تو انسان بھی ان قوانین کی اطاعت پر مجبور ہو جاتا۔ اور یہ چیز اس کے صاحب اختیار وارادہ ہونے کے یکسر منافی ہوتی۔ اس کے لئے مشیت نے یہ پروگرام مقرر کیا کہ یہ قوانین انسانوں میں سے ایک منتخب ہستی کو بذریعہ وحی دیدیئے جاتے، اور اس سے کہہ دیا جاتا کہ وہ انہیں دوسرے انسانوں کے سامنے رکھ دے

سلسلۂ نبوّت

اور ان انسانوں سے کہہ دیا جاتا کہ اسے ان کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ چاہیں تو انہیں اختیار کر لیں اور چاہے ان سے انکار کر کے، اپنے لئے کوئی اور راستہ تجویز کر لیں۔ لیکن اتنا سمجھ لیں کہ ان قوانین کے اتباع سے انہیں زندگی کی خوشگواریاں نصیب ہو جائیں گی اور ان کی خلاف ورزی کرنے سے وہ تباہ وبرباد ہو جائیں گے۔ مشیت کی اس اسکیم کا نتیجہ ہے کہ جہاں، کائنات کی تمام اشیاء، قوانین خداوندی کے آگے سر تسلیم خم کئے ہیں، انسانوں میں سے بعض ان قوانین کو مانتے ہیں اور بعض ان سے انکار کرتے ہیں۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُومُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَابُّ۔ کیا تو نے اس پر غور نہیں کیا کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب، قوانین خداوندی کے سامنے سجدہ ریز ہیں — سورج - چاند - ستارے

پہاڑ۔ درخت۔ اور جاندار۔ لیکن جہاں تک انسانوں کا تعلق ہے، ان میں سے بعض ان قوانین کے سامنے جھکتے ہیں اور بعض ان سے انکار کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان پر تباہی مسلط ہو جاتی ہے۔ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ؕ وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ؕ...... (۲۲/۱۸)۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں (جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے)

اختیار وارادہ

اشیائے کائنات کے متعلق کہا ہے کہ وَلَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا (۳/۸۲)۔ یہ سب طوعاً وکرہاً قوانین خداوندی کے سامنے جھکی ہوئی ہیں۔ انسانوں کے متعلق کہا کہ بَلٰى ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۘ (۲/۱۱۲)۔ ہاں! جو کوئی ان میں سے اپنے آپ کو قوانین خداوندی کے سامنے جھکا دے اور حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرے۔ تو اس کا اجر اس کے نشوونما دینے والے کے قانونِ مکافات کے مطابق ملے گا۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حزن۔ دوسرے مقام پر اشیائے کائنات کے متعلق کہا کہ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ (۲/۱۱۶)۔ سب اس کے قوانین کی اطاعت کرتی ہیں۔ لیکن انسانوں سے کہا گیا کہ قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ (۲/۲۳۸)۔ تم قوانین خداوندی کی اطاعت کرو۔ اسی کو حسین ترین نظامِ زندگی کہا گیا۔ یعنی انسانوں کا برضا ورغبت بطیب خاطر، اپنے اختیار وارادہ کو کام میں لاکر، علیٰ وجہ البصیرت، قوانین خداوندی کی اطاعت کرنا۔ وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ..... (۴/۱۲۵)۔ انسان کو یہ اختیار، طبیعی دنیا میں بھی حاصل ہے، اور انسانی دنیا میں بھی۔ مثلاً پانی کے لئے قانون یہ مقرر ہے کہ اگر اس پر کوئی خارجی دباؤ نہ ہو تو وہ نشیب کی طرف بہتا ہے۔ زمینیں، ندی کے نشیب کی طرف بھی ہوتی ہیں فراز کی طرف بھی۔ جو کسان اپنا کھیت نشیب کی طرف بناتا ہے وہ قانون خداوندی کی اطاعت کرتا ہے — یا یوں کہئے کہ وہ اپنی کوششوں کو قانون خداوندی سے ہم آہنگ رکھتا ہے — اور اس کا پھل پاتا ہے۔

طبیعی زندگی کے مفاد

یہ قوانین چونکہ انسان کی حیوانی سطح زندگی سے متعلق ہیں، اس لئے یہ انسان اور انسان میں کوئی فرق نہیں کرتے۔ وہ لوگ جو نہ انسانی ذات کو تسلیم کریں۔ نہ مرنے کے بعد کی زندگی پر یقین رکھیں۔ نہ مستقل اقدار کو مانیں، اور زندگی صرف اس دنیا کی طبیعی زندگی کو سمجھیں، وہ بھی اگر ان قوانین کی اطاعت کریں، تو انہیں ان کے نتائج اسی طرح ملیں گے جس طرح ان لوگوں کو جو مذکورہ بالا تمام امور پر یقین رکھیں۔ قرآن کریم نے اول الذکر طبقہ کو صرف "حیات الدنیا" کے ماننے والے اور دوسرے طبقہ کو "دنیا اور آخرت" دونوں کے ماننے والے قرار دیا ہے۔ پہلے طبقہ کی ساری کوششیں دنیاوی مفاد کے

حصول میں صرف ہو جاتی ہیں اور ان میں انسانی اقدار کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ یہ وہ ہیں جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ فَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا وَ مَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ؀ (۲/۲۰۰)۔ لوگوں میں وہ بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہمیں سب کچھ دنیاوی زندگی میں مل جائے۔ اُن کا اُخروی مفاد میں کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ وَ مِنْهُمْ مَّنْ یَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً..... (۲/۲۰۱)۔ اور وہ لوگ بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہمیں اس دنیا کی خوشگواریاں بھی نصیب ہوں اور حیاتِ اُخروی کی خوشگواریاں بھی۔ یہ لوگ قرآن کریم کی اصطلاح میں "مومن" کہلاتے ہیں۔۔۔ یعنی وہ لوگ جو خدا کے مقرر فرمودہ قوانین طبیعی کی بھی اطاعت کرتے ہیں اور مستقل اقدار کی نگہداشت بھی۔ ان کے برعکس، جو لوگ صرف قوانین طبیعی کو تسلیم کرتے ہیں اور وحی کی رُو سے عطا شدہ، مستقل اقدار کو نہیں مانتے، انہیں کافر۔۔۔ یعنی نہ ماننے والے ۔۔۔ کہا جاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ قوانین طبیعی کا ماننا اور ان کے مطابق کوشش کرنا، مومن اور کافر دونوں کے لئے ضروری ہے۔ جو بھی ان کے مطابق کوشش کرے گا۔ وہ ان کے نتائج سے بہرہ یاب ہوگا۔

مومن و کافر

قرآن کریم نے اس حقیقت کو بڑے جامع انداز میں بیان کیا ہے، جہاں فرمایا کہ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلٰهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ؀ جو کوئی، اس طبیعی زندگی کے مفادِ عاجلہ چاہتا ہے، ہم اسے اپنے قانونِ مشیت کے مطابق، یہ مفاد دیدیتے ہیں۔ لیکن اس کا مستقبل تباہ و برباد ہوتا ہے۔ وَ مَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَ سَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ؀ اور جو (دنیادی مفاد کے ساتھ) مستقبل کے مفاد بھی چاہتا ہے۔ اور اس کے لئے پوری پوری کوشش کرتا ہے اور خدا کی عطا کردہ مستقل اقدار پر ایمان رکھتا ہے، تو ان لوگوں کی کوششیں بھرپور نتائج پیدا کرتی ہیں۔ كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَ هٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ۭ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ؀ (۱۷/۱۸-۲۰)۔ ہم دونوں گروہوں کو، ان کی کوششوں کے مطابق بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ ہماری عطا کردہ نعمتوں کا دروازہ ہر ایک کے لئے یکساں طور پر کھلا ہے۔ ہم نے ان کے سامنے کوئی بند نہیں لگا دیا کہ فلاں لوگ اس کے اندر آسکیں گے اور فلاں نہیں۔

هست ایں میکدہ و دعوتِ عام است ایں جا
قسمتِ بادہ باندازۂ جام است ایں جا

قرآن کریم نے جب کہا ہے کہ وَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ؀ (۴۵/۱۳)۔ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب کو

خدا نے تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے۔ تو اس میں خطاب کسی خاص گروہ سے نہیں۔ خطاب تمام انسانوں سے ہے۔ جو قوم بھی غور و فکر سے کام لے کر، فطرت کی قوتوں کو اپنے کام میں لائے گی، وہ ان سے متمتع ہو جائے گی۔ مومن اور کافر کا فرق اس سے آگے چل کر سامنے آتا ہے۔ کافر، فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے، انہیں اپنے فیصلوں کے مطابق صرف کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ تباہیوں اور بربادیوں کا وہ جہنم ہے جس میں اس وقت دنیا مبتلا ہے۔ جس قدر فطرت کی قوتوں کی تسخیر بڑھتی جاتی ہے، اسی قدر اس جہنم کی آگ میں وسعت اور شدت پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔ لیکن مومن، فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے، انہیں خدا کی متعین فرمودہ مستقل اقدار کے مطابق صرف کرتا ہے جس سے یہ دنیا جنت کا نمونہ بن جاتی ہے۔ اسی کو حدود اللہ کے اندر رہنا کہا جاتا ہے۔ یعنی اپنی صلاحیتوں اور فطرت کی قوتوں کو ان حدود کے اندر رہتے ہوئے صرف کرنا، جنہیں خدا نے تمام نوعِ انسان کے عالمگیر مفادِ کلی کو سامنے رکھ کر متعین کیا ہے۔ مثلاً جب "قوم کافر" فطرت کی قوتوں کو مسخر کرتی ہے تو وہ انہیں اپنے مفاد اور دوسری اقوام کی تخریب کے لئے صرف کرتی ہے ... ...

مومن اور کافر کا فرق

... ... ظاہر ہے کہ جب مختلف اقوامِ عالم ان قوتوں کو، اپنے اپنے مفاد اور دوسروں کی تخریب کے لئے استعمال کریں گی تو اس سے بنائے انسانیت میں عالمگیر فساد برپا ہو جائے گا۔ لیکن جب "قوم مومن" ان قوتوں کو مسخر کرے گی تو وہ انہیں تمام نوع انسان کی پرورش اور نشو و نما کے لئے صرف کرے گی۔ کیونکہ ربوبیت عالمینی ایک مستقل قدر ہے۔ جسے یہ ہاتھ سے چھوڑ نہیں سکتی۔ یا مثلاً جب حکومت "قوم کافر" کے ہاتھ میں آئے گی تو وہ معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کرے گی۔ اسے مختلف طبقات میں تقسیم کر دے گی جس سے غریب، غریب تر، اور امیر، امیر تر ہوتے چلے جائیں گے۔ عدل و انصاف مٹ جائے گا اور تمام فیصلے حکمران طبقہ کے مفاد کے ماتحت ہوں گے۔ لیکن جب یہی حکومت، قوم مومن کے ہاتھ میں آئے گی تو وہ معاشرہ میں ہمواریاں پیدا کرے گی۔ تمام افرادِ معاشرہ کے لئے سامانِ زیست اور اسبابِ نشو و نما ضرورت کے مطابق مہیا ہوں گے۔ ہر انسان کی، بہ حیثیت انسان عزت و تکریم ہو گی۔ ہر معاملہ کا فیصلہ قوانین خداوندی کے مطابق ہو گا۔ اس میں نہ کسی کی رعایت ہو گی نہ کسی کے خلاف زیادتی۔ اس لئے کہ ان تمام امور کے لئے، خدا کی طرف سے دیئے ہوئے اصول و قوانین پر ان کا ایمان ہو گا اور انہی کے مطابق زندگی بسر کرنا ان کا نصب العین حیات۔ اس سے جہاں اس دنیا میں جنتی معاشرہ قائم ہو جائے گا، اس کے ساتھ ان کی اپنی ذات کی نشو و نما ایسے انداز سے ہوتی جائے گی جس سے وہ، مرنے کے بعد کی زندگی میں ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔ یعنی یہاں بھی جنت وہاں بھی جنت۔ اس لئے کہ انسانی ذات کی نشو و نما کا راز، نوعِ انسان کی عالمگیر ربوبیت

اور نظام عدل واحسان میں پوشیدہ ہے۔

اسلام کیا ہے؟

تصریحاتِ بالا سے واضح ہے کہ انسانوں کی دنیا میں اسلام نام ہے، طبیعی دنیا سے متعلق قوانین خداوندی سے ہم آہنگی اور وحی کی رُو سے عطا شدہ مستقل اقدار و اصولِ حیات کے مطابق زندگی۔ بالفاظِ دیگر، فطرت کی قوتوں کو مسخر کرکے، انہیں قوانین خداوندی کے مطابق صرف میں لانا، اسلام ہے۔

اب ہمارے سامنے تین قسم کے گروہ آگئے۔

(۱) پہلا گروہ ان لوگوں کا جو قوانین فطرت کی متابعت سے (جسے فزیکل سائنس کہتے ہیں) کائناتی قوتوں کو مسخر کر لیتے ہیں لیکن مستقل اقدار پر ایمان نہیں رکھتے۔ انہیں دنیا کے مادی مفاد حاصل ہو جاتے ہیں لیکن ان کا معاشرہ جہنمی ہوتا ہے۔ اور جن لوگوں کا یہاں معاشرہ جہنمی ہو، ان کا مستقبل بھی جہنمی ہوتا ہے۔

(۲) دوسرا گروہ ان لوگوں کا جو فزیکل سائنس کی رُو سے فطرت کی قوتوں کو مسخر کر لیتے ہیں اور پھر انہیں مستقل اقدار کے مطابق صرف کرتے ہیں۔ ان کی زندگی یہاں بھی جنتی ہوتی ہے اور آخرت میں بھی جنتی۔

(۳) تیسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو فطرت کی قوتوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کی موجودہ دنیا کی زندگی؛ ذلت وخواری اور محتاجی وکس مپرسی کی زندگی ہوگی۔ وہ سامانِ زیست تک کے لئے دوسری قوموں کے دست نگر ہوں گے۔

اس سے یہ اہم سوال سامنے آتا ہے کہ اگر یہ گروہ، خدا۔ وحی۔ آخرت پر ایمان کا مدعی ہو، تو کیا ان کی اُخروی زندگی کامیاب وکامران ہو جائے گی؟ اس کا جواب واضح ہے۔ خدا۔ وحی۔ آخرت۔ یا مستقل اقدار پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کرکے انہیں مستقل اقدار کے مطابق صرف کیا جائے

دنیا اور آخرت

اب جو قوم فطرت کی قوتوں سے محروم ہے، اس کے لئے ان قوتوں کے صرف کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لہذا، خدا۔ وحی۔ آخرت۔ مستقل اقدار وغیرہ پر اس کا ایمان محض لفظی دعوےٰ ہے جو کبھی عمل میں نہیں آتا۔ اور جو ایمان عمل میں نہیں آتا وہ اپنے نتائج کیا پیدا کرے گا؟ یہ خیال غلط ہے کہ اس دنیا میں یہ لوگ خواہ تباہ حال ہی کیوں نہ ہوں، ان کی عاقبت بہرحال سنور جائے گی۔ یہ خیال رہبانیت کا پیدا کردہ ہے جو انسانی ذہن کی اپنی اختراع ہے۔ اس سے انسان اس فریب میں مبتلا رہتا ہے کہ یہاں کی تباہی اور زبوں حالی کا عاقبت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ بلکہ جو یہاں جتنا زیادہ زبوں حال ہوگا وہ عاقبت میں اتنا ہی خوش بخت ہوگا۔ قرآن کریم اس کی کھلے الفاظ میں تردید کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جس قوم پر اس دنیا میں مادی

سامانِ زیست کے دروازے نہیں کھلتے، اس کی عاقبت کبھی سنور نہیں سکتی۔ وہ کھلے الفاظ میں بتاتا ہے کہ وَ مَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً ضَنْكًا۔ جو ہمارے قوانین سے اعراض برتتا ہے اس کی معیشت تنگ ہو جاتی ہے۔ یہ یہاں کی بدحالی ہے۔ وَ نَحْشُرُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَعْمٰی (۲۰/۱۲۴)۔ اور اسے ہم قیامت میں بھی اندھا اٹھائیں گے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ قوانین فطرت بھی خدا ہی کے متعین کردہ قوانین ہیں۔ ان کی خلاف ورزی کرنے، یا ان سے اعراض برتنے کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہے۔ قرآن کریم کا ایک بڑا حصہ ان قوانین کی اہمیت پر زور دیتا ہے۔ اگر ہم قرآن کریم کے اس حصے سے انکار کرتے ہیں، تو دوسرے حصے کا زبانی اقرار ہمیں کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔ قرآن کریم کے الفاظ ہیں۔ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ کیا تم ایسی روش اختیار کرنا چاہتے ہو کہ قوانین خداوندی کے ایک حصے پر ایمان رکھو اور دوسرے حصے سے انکار کرو۔ فَمَا جَزَآءُ مَنْ یَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْیٌ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ یُرَدُّوْنَ اِلٰۤی اَشَدِّ الْعَذَابِ ......(۲/۸۵)۔ جو کوئی ایسا کرے گا تو اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہو گا کہ اسے اس دنیا میں بھی ذلت و خواری نصیب ہو گی اور وہ قیامت میں شدید ترین عذاب میں مبتلا ہو گا۔ آپ نے دیکھا کہ قوانین خداوندی کے ایک حصے سے انکار کرنے اور دوسرے حصے پر ایمان رکھنے کا نتیجہ صرف اسی دنیا کی ذلت و خواری نہیں بلکہ آخرت کی تباہی اور بربادی بھی ہے۔ یہ اس لئے کہ (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) دوسرے حصے (یعنی مستقل اقدار) پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ اُسے پہلے حصے (یعنی دنیاوی معاشرہ) میں عملاً نافذ کیا جائے۔ قرآن کریم کے احکام و قوانین، دنیاوی زندگی کو وحی الٰہی کے مطابق صحیح خطوط پر متشکل کرنے کے لئے ہیں۔ حتیٰ کہ صلوٰۃ جیسی "عبادت" بھی اسی حقیقت کی یاد تازہ کرانے اور اس آرزو کو بیدار کرنے کے لئے ہے کہ ہم زندگی کے ہر گوشے میں قوانین خداوندی کی محکومیت اختیار کریں گے۔ ہم اس کے قوانین کے سامنے جھکیں گے۔ لہذا، دنیاوی زندگی کو قابلِ اعتناء نہ سمجھنا اور خیال یہ کرنا کہ ہم قوانین خداوندی کی اطاعت کر رہے ہیں، اپنے آپ کو دھوکا دینا ہے۔ یاد رکھئے! جسے اس دنیا کی خوشگواریاں حاصل نہیں، یا وہ ان کے حصول کی کوشش نہیں کرتا وہ قوانین خداوندی کی اطاعت نہیں کرتا۔ اور اسی لئے اُسے اُس دنیا کی خوشگواریاں بھی حاصل نہیں ہو سکتیں۔ رَبَّنَاۤ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً مومن کا صحیح شعارِ زندگی ہے۔ اور جس روش کا نتیجہ یہ نہیں، وہ اسلام نہیں۔ کچھ اور ہے۔ ایمان و عمل صالح کا لازمی نتیجہ اس زمین کی سرفرازی و سربلندی۔ حکومت و سطوت ہے۔ (۲۴/۵۵)۔ یہ خدا کا اٹل وعدہ ہے۔ جس کی دنیا خراب ہے اور وہ اس خرابی کو دور کرنے کی کوشش نہیں کرتا، اس کی آخرت بھی تباہ و برباد ہے۔

وہ کل کے غم و عیش پہ کچھ حق نہیں رکھتا — جو آج جگر سوز د خود افروز نہیں ہے
وہ قوم نہیں لائقِ ہنگامۂ فردا — جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے

دین اس لیئے آتا ہے کہ وہ انسان کے دنیاوی معاملات سنوار دے۔ انہی معاملات کے سنورنے سے اُس کی عاقبت سنورتی ہے۔ جس قوم کے دنیاوی معاملات سنورے ہوئے نہ ہوں، اور وہ عالمِ انسانیت کے بگڑے ہوئے معاملات کو سنوارنے کی فکر نہ کرے، سمجھ لیجئے کہ اس قوم کی عاقبت سنوری ہوئی نہیں۔ دین ایک ایسا معاشرہ قائم کرتا ہے جو انسانی زندگی میں حسن پیدا کر دیتا ہے۔ آپ انسانی تاریخ پر نگاہ ڈالیئے، یہاں سے وہاں تک ایک سلسلۂ صید و صیاد نظر آئے گا جس میں ہر فرد اور ہر قوم کی کوشش ہوگی کہ وہ دوسرے فرد اور دوسری قوم کو اپنا شکار بنائے۔ اس کے لیئے طرح طرح کی تدبیریں اختیار کی جائیں گی۔ قسم قسم کے جال بچھائے جائیں گے۔ کوئی ہمرنگِ زمیں، کوئی مقدس پردوں کی اوٹ میں۔ ہر طاقتور کمزوروں کا خون چوسے گا۔ ہر زیرک، دوسروں کو بے قوت بنا کر ان کے گاڑھے پسینہ کی کمائی پر عیش کی زندگی بسر کرے گا۔

دین کی غایت

یوں، تو ان شکاریوں کی بہت سی قسمیں ہیں، لیکن اگر ان کی اصولی تقسیم کی جائے تو تین بڑی بڑی شاخیں ہمارے سامنے آئیں گی — مستبد حکومت۔ باطل مذہبی پیشوائیت۔ اور خون آشام نظام سرمایہ داری —

دین، ان تینوں لعنتوں کو مٹا کر ایک ایسا نظام قائم کرتا ہے جس میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم اور محتاج نہ رہے؛ وہ ایک ایسا معاشرہ متشکل کرتا ہے جس میں ہر فرد وہ کچھ بن سکے جو کچھ بن سکنے کا اُس میں امکان ہے۔ غلط معاشرہ میں، جوہرِ انسانیت کے کروڑوں غنچے بن کھلے مرجھا جاتے ہیں، لیکن دین کی رُو سے قائم کردہ معاشرہ میں، ایک فرد بھی ایسا نہیں رہتا جس کی مضمر صلاحیتیں نشو و نما پا کر، برومند نہ ہوں۔ آپ غور کیجئے کہ کتنا بڑا انقلاب ہے جو عالمِ انسانیت میں دین کی رو سے برپا ہوتا ہے۔ وہ پہلے اس معاشرہ کو ایک خطۂ زمین میں متشکل کرتا ہے اور پھر اس کے دائرے کو وسیع کرتا چلا جاتا ہے تاکہ یہ پوری عالمگیر انسانیت کو اپنے آغوش میں لے لے۔ اس لیئے کہ اس کے سامنے، پورے کے پورے صفحۂ ارض سے، سلب و نہب اور ظلم و جور کو مٹا کر، عدل و احسان کا نظام قائم کرنا ہوتا ہے۔ اس طرح وہ ساری نوعِ انسان کو ایک عالمگیر برادری بنا کر اسے اخوت کے رشتے میں پرو دیتا ہے۔ یہ ہے دین کا مقصود۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں۔

> نبوتِ محمدیہ کی غایت الغایات یہ ہے کہ ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ قائم کی جائے جس کی تشکیل اُس قانونِ الٰہی کے تابع ہو، جو نبوتِ محمدیہ کو بارگاہِ الٰہی سے عطا ہوا تھا۔ بالفاظِ دیگر یوں کہئے کہ بنی نوعِ انسان کو، باوجود شعوب و قبائل اور الوان و السنہ کے اختلافات کو تسلیم کر لینے کے، انہیں ان تمام آلودگیوں سے منزہ کیا جائے جو زمان، مکان، قوم، نسل، نسب ملک وغیرہ کے

جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں — بے ید بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں
عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف — ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں

وہ شرعِ پیغمبر جو ہر طاغوتی قوت کے لئے سامانِ موت ہے۔

الحذر آئینِ پیغمبر سے سو بار الحذر — حافظِ ناموسِ زن۔ مرد آزما۔ مرد آفریں
موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے — نے کوئی فغفور و خاقاں، نے فقیرِ رہ نشیں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب — پادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں

اس کے بعد وہ اپنے مشیروں سے کہتا ہے کہ

چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب — یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محرومِ یقیں

مشیروں نے پوچھا کہ اس کے لئے ہمیں کرنا کیا چاہیئے! اس نے کہا کہ اس کا علاج بہت سہل ہے۔ تم اس قوم کو اس قسم کے مسائل میں الجھائے رکھو کہ

ابنِ مریم مر گیا یا زندۂ جاوید ہے — ہیں صفاتِ ذاتِ حق، حق سے جدا یا عینِ ذات
آنے والے سے مسیحِ ناصری مقصود ہے — یا مجدد جس میں ہوں فرزندِ مریم کے صفات
ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم — امتِ مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات
کیا مسلماں کے لئے کافی نہیں اس دور میں — یہ الٰہیات کے ترشے ہوئے لات و منات
تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے — تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات
خیر اسی میں ہے قیامت تک رہے مومن غلام — چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہانِ بے ثبات

تمہارے کرنے کا کام ہے کہ

مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اسے — پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

برادرانِ عزیز! ایک اسلام وہ تھا جسے محمد رسول اللہ والذین معہ نے پیش کیا تھا اور جس سے اقوامِ عالم کی امامت ہمارے حصے میں آگئی تھی اور ایک اسلام ہمارا آج کا ہے جس سے ہمارا (یعنی مسلمانانِ عالم) کا شمار دنیا کی پست ترین قوموں میں ہوتا ہے۔

یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل — یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدا مست — یہ مذہبِ ملا و نباتات و جمادات

لیکن وہ اسلام جس نے اُس وقت ہمیں وہ سرفرازیاں عطا کی تھیں، ہمارے پاس آج بھی خدا کی زندہ و پایندہ کتاب میں محفوظ ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اسے ایک نظام کی شکل میں متشکل کرنے کی سعادت کس کے حصے میں آتی ہے؟ والسّلام

اتحاد پریس ملی روڈ لاہور

جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں — بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں
عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف — ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں

وہ شریعت پیغمبر جو ہر طاغوتی قوت کے لئے سامانِ موت ہے۔

الحذر آئینِ پیغمبر سے سو بار الحذر — حافظِ ناموسِ زن، مرد آزما، مرد آفریں
موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے — نے کوئی فغفور و خاقاں، نے فقیرِ رہ نشیں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب — پادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں

اس کے بعد وہ اپنے مشیروں سے کہتا ہے کہ

چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب — یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محرومِ یقیں

مشیروں نے پوچھا کہ اس کے لئے ہمیں کرنا کیا چاہیئے! اس نے کہا کہ اس کا علاج بہت سہل ہے۔ تم اس قوم کو اس قسم کے مسائل میں الجھائے رکھو کہ

ابنِ مریم مر گیا یا زندۂ جاوید ہے — ہیں صفاتِ ذاتِ حق، حق سے جدا یا عینِ ذات
آنے والے سے مسیحِ ناصری مقصود ہے — یا مجدد جس میں ہوں فرزندِ مریم کے صفات
ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم — امتِ مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات
کیا مسلماں کے لئے کافی نہیں اس دور میں — یہ الٰہیات کے ترشے ہوئے لات و منات
تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے — تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات
خیر اسی میں ہے قیامت تک رہے مومن غلام — چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہانِ بے ثبات

تمہارے کرنے کا کام ہے کہ

مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اسے — پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

برادرانِ عزیز! ایک اسلام وہ تھا جسے محمد رسول اللہ والذین معہٗ نے پیش کیا تھا اور جس سے اقوامِ عالم کی امامت ہمارے حصے میں آگئی تھی اور ایک اسلام ہمارا آج کا ہے جس سے ہمارا (یعنی مسلمانانِ عالم) کا شمار دنیا کی پست ترین قوموں میں ہوتا ہے

یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل — یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدا مست — یہ مذہبِ ملا و نباتات و جمادات

لیکن وہ اسلام جس نے اس وقت ہمیں وہ سرفرازیاں عطا کی تھیں، ہمارے پاس آج بھی خدا کی زندہ و پائندہ کتاب میں محفوظ ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اسے ایک نظام کی شکل میں متشکل کرنے کی سعادت کس کے حصے میں آتی ہے۔ والسلام

اتحاد پریس ملز روڈ لاہور